© rasailojaraid.com

ڈاکٹر معین الدین عقیل

دُنیائے اسلام میں تحریکِ مغربیت اور اقبال

دنیائے اسلام میں دورِ جدید کے آغاز اور ذہنی، تہذیبی اور سیاسی تبدیلیوں کا ایک بڑا محرک مغرب کا اثر ہے، جسے مغربیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ دراصل 'مغرب' کو مسلم معاشرہ میں سرایت کرنے کا عمل ہے[1] اس اثر کی اولاً زیادہ ذمہ داری ترکوں پر عائد ہوسکتی ہے، جن کی شعوری اور لاشعوری حکمت عملیوں سے دُنیائے اسلام میں مغرب کے اثرات کا آغاز ہوا۔ مشرق قریب کی شاہراہیں، جو مختلف براعظموں کے درمیان آمدورفت اور حمل ونقل کا عام ذریعہ تھیں، عثمانی ترکوں کے قبضے میں تھیں، اس لیے مغربی اقوام کو ہندوستان اور مشرق بعید کے لیے نیا راستہ تلاش کرنا پڑا۔ اُنھوں نے نہ صرف نیا راستہ تلاش کرلیا، جس میں جنوبی افریقہ کا چکر کاٹنا پڑتا تھا بلکہ حسنِ اتفاق سے اسی کوشش میں اُنھوں نے نئی دُنیا (امریکہ) دریافت کرلی۔ اس طرح مشرقی عربی دُنیا کا انقطاع زیادہ شدید ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باہر سے نئے افکار پہنچنے کی کوئی صورت نہ رہی اور جمود و تعطل کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ عثمانی ترکوں کی حکمرانی اور مغرب پر ان کی عسکری ہیبت کا یہ ایک مضر اثر تھا، لیکن اس کی تلافی بھی ترکوں ہی نے کی اور دُنیائے اسلام کو مغرب کے تصورات اور افکار و ایجادات سے روشناس کرانے کا آغاز کیا۔ ان کا یہ اقدام دُنیائے اسلام میں فکری، تہذیبی اور سیاسی انقلاب اور تبدیلیوں کا ایک بڑا محرک ثابت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ صدی سے دُنیائے اسلام خود ایسی انقلابی قوتیں پیدا کر رہا ہے، جو اگرچہ بیرونی و مغربی تحریکوں سے بھی اثر قبول کر رہی ہیں، لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے داخلی بھی ہیں اور ان کا مطمح نظر جدید

---

[1] "The Cambridge History of Islam." (کیمبرج، ۱۹۷۷ء) ج ۲، ص ۶۴۷ (آئندہ، کیمبرج)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات کے تقاضوں میں اسلام کے حقیقی مقاصد کا حصول بھی ہے۔ ان سب کے باوجود دنیائے اسلام کی موجودہ زندگی میں مغرب کے اثرات بہت واضح اور کئی صورتوں میں انمٹ ہیں۔ دنیائے اسلام نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ان اثرات کو اپنے وجود میں قبول کر لیا ہے اور مسلمان تہذیب و فکرِ فرنگ کے جلوؤں سے خیرہ ہو گئے ہیں۔ خیرگی کی یہ کیفیت ان ممالک میں زیادہ ہے جو یورپی ممالک کے زیرِ تسلط آئے۔ لیکن وہ ممالک بھی اس سے کم و بیش محفوظ نہ رہ سکے، جہاں یورپی تسلط برائے نام رہا۔ اس قسم کے بعض ممالک میں تو یہ اثرات بہت پہلے پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے تمام طبقات، جنھوں نے مغربی ترقی کا کسی حد تک بھی مشاہدہ کیا، وہ مغرب کی ترقی، اس کے ذرائع آمد و رفت، مطابع، صنعتی و زرعی مشینوں اور آرام و آسائش کی کلوں کو دیکھ کر مسحور ہو کر رہ گئے۔

دُنیائے اسلام کا مغرب سے رابطہ اور تعلق پہلے پہل ترکی کے توسّط سے ہوا۔ دولتِ عثمانیہ کا قیام قریب قریب اس زمانے میں ہوا، جب یورپ ذہنی ارتقا اور علمی ترقی کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ اگرچہ ترکوں نے ابتدائی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ کو پیہم شکستیں دے کر اسلام کی اور اپنی دھاک بٹھادی تھی، لیکن اس زمانے میں عام مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ تنزل کا شکار ہو رہے تھے اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوموں سے تھا، وہ تیز رفتاری کے ساتھ ذہنی و مادی ترقی کی راہ پر دوڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی میں ترکوں کی سیاسی، علمی، تمدنی اور اخلاقی حالت اس تنزل کو پہنچ گئی کہ یورپ کو ان پر اثر جمانے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ خود ان کے ماتحت عیسائی اور مغربی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات کو قبول کر کے سلطنت کے ایک بڑے طبقے کو مغرب کے قریب پہنچا چکی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طبقہ بھی سلطنت میں پیدا ہو گیا تھا، جو دنیائے اسلام کی سلامتی و بقا کے لیے مغربی طور طریقوں، ہتھیاروں اور تصورات کو اختیار کرنے کے حق میں ہو گیا۔

دوسری جانب مغربی دنیا سولھویں صدی کے اختتام سے قبل سمندروں کی تسخیر کے نتیجے میں دُنیائے اسلام کو اپنے نرغے میں لینے میں کامیاب ہو گئی تھی، مگر اسے پوری طرح اپنے قبضے میں لینے کی جسارت نہیں کر سکی۔ دُنیائے اسلام کی داخلی کمزوریوں کے باعث اسے بہت عرصہ پہلے مغرب کے قبضے میں چلے جانا چاہیے تھا، لیکن اس میں تاخیر کی ایک بڑی وجہ محض ترکوں اور مسلمانوں کی عسکری شجاعت کی وہ داستانیں تھیں، جن کی ہیبت اہلِ مغرب کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی، چنانچہ اہلِ مغرب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتہائی محتاط رہے اور درپردہ تیاریوں میں مصروف رہے[۵۲] ترکوں کے ہاتھوں مغربی اقوام کی پسپائی سے اہلِ مغرب نے یہ سبق سیکھا تھا کہ انھیں اب دنیائے اسلام پر ناکام صلیبی جنگوں کے طرز پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیے، بلکہ پہلے سمندروں کو فتح کرکے دُنیائے اسلام کو گھیرے میں لے لینا چاہیے۔ ان کی یہ حکمتِ عملی بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کے نشے میں یورپ سے بے خبری کا شکار رہے۔ ان کا یہ نشہ اس وقت ٹوٹا جب سلطنت عثمانیہ اور دوسری مسلمان قوتیں اپنے مخالفین کے ہاتھوں پے در پے شکست سے دوچار ہوئیں۔ ان کی یہ شکستیں مخالفین کے جدید نظامِ حرب اور سائنسی آلات کے طفیل ہوئیں۔ سلطان سلیم سوم کی رائج کردہ عسکری اصلاحات کو ۱۷۶۸ء-۱۷۷۴ء کی روس و ترکی کی جنگوں میں روس کے ہاتھوں ترکی کی شکست کے احساس نے تقویت بخشی۔ کیونکہ روس اس وقت تک مغربی عسکری فنون میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔[۵۳] پھر ۱۷۹۸ء میں مصر میں فرانس کی جارحیت نے انھیں یورپ کی ترقی سے مزید مرعوب اور اسے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔ یہی مرعوبیت دُنیائے اسلام میں ترکی کے توسط سے 'مدافعتی جدیدیت' کا باعث ہوئی، جو مغرب کے فکری، تہذیبی اور تمدنی اثرات کا سرچشمہ بنی۔ 'مدافعتی جدیدیت' کا آغاز ترکی میں اٹھارویں صدی میں، مصر اور ایران میں انیسویں صدی میں اور افغانستان اور جزیرۃ العرب میں بیسویں صدی میں ہوا۔ مغربی اثرات دُنیائے اسلام میں یورپ سے جنگی اور صنعتی مرعوبیت کے نتیجے میں 'مدافعتی جدیدیت' کے توسط سے یا یورپی استعماریت اور پھر بقائے باہمی کے نظریے کے تحت پہنچے[۵۴] 'مدافعتی جدیدیت' سے قطع نظر مغربی استعمار کا نشانہ ہندوستان اور انڈونیشیا سترھویں صدی میں اور وسطی ایشیا اور اسلامی افریقہ انیسویں صدی میں بنے۔ مساویانہ بقائے باہمی کے تصور کے تحت مغربی اثرات کے دور کا آغاز ترکی میں بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے ہوا۔[۵۵]

ترکی میں عسکری اصلاحات کے توسط سے مغربیت کا اولین اور ناکامیاب راہ کشا سلطان سلیم

---

۵۲ آرنلڈ جے۔ ٹائن بی۔ "The world and the West" (لندن، ۱۹۵۳ء) ص: ۲۱

۵۳ ایضاً، ص: ۲۰

۵۴ کیمبرج، ج: ۱، ص: ۶۷۳، ۶۷۵

۵۵ ایضاً، ص: ۶۷۵ - ۶۷۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوم تھا، لیکن مغربی طرز زندگی کو رائج کرنے میں سلطان محمود دوم اس کا جانشین ثابت ہوا۔ دونوں نے اپنی مملکت میں مغربیت کا آغاز افواج کو مغربی طرز پر تربیت دینے سے کیا۔ ان سے پہلے اسلامی اور مغربی تہذیب کے مابین ایک فطری ربط پیدا کرنے کی ایک ابتدائی کوشش سلطان محمد فاتح نے تقریباً ڈھائی سو سال قبل کی تھی کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے اثر قبول کریں اور روایت پرستی کی جگہ تنقیدی بصیرت کو فروغ حاصل ہو، لیکن یہ کوشش ناکام رہی[۶] سلطان سلیم نے عسکری اصلاحات کے علاوہ بعض ایسے اقدامات بھی کیے، جن سے ترکوں کی ذہنی زندگی میں نئی راہیں کھلیں۔ انقلاب فرانس کے سیاسی اور علمی اثرات نے سلطان سلیم کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا[۷] چنانچہ فرانس سے اساتذہ بلائے گئے اور جدید علوم کی درس گاہیں کھولی گئیں۔ تہذیبی لین دین شروع ہوا۔ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے لگے۔ اس طرح اٹھارویں صدی کے اختتام تک ترکی میں ایک ایسی جماعت بن گئی، جو فرانسیسی زبان سے واقف تھی۔ یہ زبان ترکی میں جدید مغربی افکار کی اشاعت کا ذریعہ بنی اور اس نے فکر اور فن دونوں کو متاثر کیا۔

عسکری اصلاحات کی کوششوں کا نتیجہ 'مفید اور غیر مفید' کسی نہ کسی صورت میں ضرور نکلا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے روح رواں وہ نوجوان فوجی افسر ہی تھے، جن کی تربیت مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ اس انقلاب کا مقصد ۱۸۷۶ء کے مغربی نوعیت کے پارلیمانی دستور کو دوبارہ نافذ کرنا تھا، جس کو سلطان عبدالحمید نے برسرِ اقتدار آکر منسوخ کر دیا تھا۔ سلطان سلیم سوم کے سو سال بعد سلطان عبدالحمید کے تیس سالہ مطلق العنان عہد حکومت کی سیاسی حکمت عملی یہ رہی کہ مغربی حریت پسندی کو ترکی میں کبھی دوبارہ سر نہ اُٹھانے دیا جائے اور اس قسم کے رجحانات کی بیخ کنی کر دی جائے۔ اس کے عہد حکومت میں کتابوں پر سخت احتساب اور تعلیم پر کڑی نگرانی تھی، لیکن فوجوں کی تعلیم اور تربیت اس سے مستثنیٰ رہی۔ کیونکہ اسے یہ احساس تھا کہ اگر زیرِ تربیت ترک فوج کو مغربی عسکری تعلیم سے محروم رکھا گیا تو کوئی غیر ملکی طاقت اپنی عسکری اہلیت کی بنا پر

۶۔ عبدالحق عدنان ادیوار۔ "Interaction of Islamic and Political thought" مشمولہ کوئیلر ینگ "Near Eastern culture and society in Turkey" (پرنسٹن ۱۹۶۶ء) ص: ۱۲۱۔۱۲۲

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترکی کو فتح کرکے اسے اقتدار سے محروم کردے گی ۔ ترک فوج کو مغربی عسکری نصابی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے مغربی زبانیں سیکھنے کی اجازت بھی دے دی گئی، چنانچہ ان کے ذہنوں کو مغربی سیاسی افکار سے محفوظ رکھنا ناممکن ثابت ہوا ۔ سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت میں زیر تربیت فوج ترکی کی وہ واحد جماعت تھی، جس کا ذہنی دریچہ مغربی اثرات کے حصول کے لیے کھلا تھا اور یہی جماعت ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں ہراول ثابت ہوئی ۔

سلطان سلیم سوم سے سلطان عبدالحمید کے دور تک مغربیت کے قائل ترک سلاطین اسے جس حد تک اپنی مملکت میں رائج دیکھنا چاہتے تھے، اس حد تک بھی وہ مغربی تہذیب سے محبت نہ رکھتے تھے[۸] وہ چاہتے تھے کہ مغربیت کی صرف اتنی خوراک ہی استعمال میں لائی جائے جو اس "مردِ بیمار" کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہو ۔ ان دونوں کا بنیادی مقصد ایسی اصلاحات کا نفاذ تھا کہ جن سے وہ مغربی قوموں کے دوش بدوش ترقی کرسکیں ۔ اسلام سے لگاؤ ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا ۔ ان کے دل و دماغ دونوں مسلمان تھے ۔ ان میں اپنی کمزوریوں کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلے میں کمتری کا احساس نہیں تھا ۔ وہ مغرب سے مرعوب بھی نہ تھے اور اس کی ہر چیز کو قبول بھی نہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس ضمن میں ان کا مقصد اتنا تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی مملکت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کردیں اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ مسابقت کرسکیں[۹] لیکن ان کا یہ مطمحِ نظر ناکام رہا ۔ سلطان عبدالحمید کے دورِ استبداد اور مطلق العنانی نے ان کے عمدہ منصوبوں پہ پانی پھیر دیا ۔ ۱۹۰۸ء کا انقلاب جن جوشیلے اور مشتعل نوجوانوں کے طفیل آیا، وہ "عہدِ تنظیمات" کے اصلاح پسندوں سے بہت مختلف تھے ۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر اور فکر میں "تنظیمات" کے مدبرین کا ہمسر ہو ۔ یہ ایسے نوجوانوں کا ٹولہ تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے اور اخلاقی تربیت سے بے بہرہ تھے ۔ قدیم اور جدید کے فرق کو بھی نہیں سمجھتے تھے ۔ مغربی علوم پر گہری نظر بھی نہ رکھتے تھے، اس لیے مغرب سے حد درجہ مرعوبیت ان میں نمایاں تھی ۔ ان کی نظر صرف مغرب کی ظاہری اور مادی، تجارتی و صنعتی ترقی تک رہی[۱۰] اس انقلاب کے ایک پیرو مصطفےٰ کمال

---

[۸] ٹائن بی، تصنیف مذکور، ص ۲۵

[۹] خالدہ ادیب خانم "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" اردو ترجمہ، ڈاکٹر سید عابد حسین (دہلی، ۱۹۳۸ء) ص ۱۳۲

[۱۰] ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے دورِ اقتدار میں مغربیت کو سیاست اور زندگی کے ہر شعبے میں بالجبر رائج کر دیا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء کی درمیانی مدّت میں ترکی میں کئی اہم انقلابی اور دُور رس تبدیلیاں لائی گئیں، جن میں مذہب اور سیاست کی علیحدگی، اتحادِ اسلامی کے بجائے اتحاد تورانی پر زور، ترکی زبان کے لیے عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کے اجرا اور آزادیٔ نسواں نے ترکی کی پوری روایتی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا اور اس کے دانشور طبقے، مثلاً ضیا گوکلپ کی فکر اس منزل تک پہنچ گئی کہ اسلام کی روحانی بنیادوں اور اس کے تصوّرِ اُمت و ملّت کی نفی کرتے ہوئے خود کو اور ترکی کو مغربی تہذیب کا جزو قرار دے دیا۔[۱۱] اس کے برعکس جس شخص نے مغربی تہذیب و علوم سے استفادے کی زیادہ متوازن دعوت دی اور ترکی و مغرب کے تعلق کی نوعیت کی مناسب وضاحت کی، وہ نامق کمال تھے۔ انھوں نے اسلام کے دینی، اخلاقی اور سیاسی نظام کو اصل صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔[۱۲] اپنے افکار و خیالات کے اعتبار سے ان کا اثر بھی ترکی کی جدید نسل پر بہت گہرا ہے اور اُنھیں عام مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن ترکی میں مغربیت اس حد تک سرایت کر چکی تھی اور اسے عوام کی اس قدر توجہ حاصل ہو چکی تھی کہ باوجود عام مقبولیت اور اثر کے ان کی متوازن فکر اور نسبتاً معتدل دعوت کو ترکی کی جدید تشکیل میں وہ مؤثر اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو بدلتے ہوئے حالات میں ضیا گوکلپ کا مقدر بن چکی تھی۔ اتاترک کی اصلاحات پر بھی ضیا گوکلپ کے فکری اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔[۱۳]

دنیائے اسلام میں ترکی کے علاوہ، مصر نے سب سے پہلے مغربی دُنیا کے ساتھ ربط و تعلق پیدا کیا

---

[۱۱] ضیا گوکلپ "Turkish Nationalism and Western Civilization" مرتبہ و مترجمہ، نیازی برکیس (لندن، ۱۹۵۹ء) ص ۲۶۷، اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ مغربی تہذیب درحقیقت بحیرۂ روم کی تہذیب کا تسلسل ہے۔ اس تہذیب کے بانی سماری، سیتھی، فنیقی اور دغاۃ ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا۔ اس بنیاد پر ترک مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ان کا اس میں حصّہ ہے۔

[۱۲] نیازی برکیس، مقدمہ ص ۱۷

[۱۳] ان کا جائزہ نیازی برکیس نے لیا ہے، ایضاً ص ۱۳۰-۱۴۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسے استوار رکھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں نپولین کے حملۂ مصر نے مصر کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی اور مصر کو ایک نئی زندگی، قومیت اور مغربیت کے احساس سے آشنا کیا۔ نپولین کے حملے کے بعد عیسائی مبلغ، سیاح، آثار قدیمہ کے ماہر، تاجر وغیرہ بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر جوق در جوق اُترنے لگے اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ نپولین اور پھر محمد علی (الکبیر) کے ساتھ مصر میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ اگرچہ محمد علی قدیم عثمانی روایات کے زیر اثر پروان چڑھا تھا اور اسے بیرونی دُنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس کے باوجود اس نے مغربی ترقی کی اہمیت اچھی طرح سمجھ لی اور مغربی آداب و اطوار اختیار کرنے کے لیے جوش و خروش کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں یورپی ماہرین سے اپنے منصوبوں کی تشکیل میں مدد لی۔ اپنی فوج کی تنظیم بھی اس نے فرانسیسی فوج کے نمونے پر کی اور فرانسیسی افسر ہی اس کی تربیت کرتے۔ نظام تعلیم میں بھی اس نے انقلابی تبدیلیاں کیں۔ فرانسیسیوں کو اس نے معلم اور نصاب ساز مقرر کیا اور تعلیم کے لیے طلبہ مستقل طور پر یورپ بھیجے جانے لگے۔[14] اس راہ میں محمد علی اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے اہلِ یورپ کو مصر میں بس جانے کی اجازت بھی دے دی۔[15] یہ سب کچھ ہوا اور مغربی ترقی کی تمام قدردانی کے باوجود محمد علی نے اہل یورپ کو کبھی یہ اجازت نہ دی کہ وہ اسے اپنے اشاروں پر چلانے کی جرأت کریں۔ اس نے نہر سویز کھولنے کے لیے ان کی ترغیبات پر بھی کان نہیں دھرے۔ وہ اس قدر معاملہ فہم تھا کہ اس نے سمجھ لیا کہ نہر کے کھلتے ہی مصر یورپ کے قبضے میں چلا جائے گا۔ لیکن اس کے جانشینوں نے بغیر کسی پس و پیش کے دوسروں کے آگے سر جھکا دیا۔ اس لیے ان کے عہد میں اہل مغرب حکومت اور ملک کے مالک بن گئے۔

---

[14] طلبہ کا سب سے پہلا گروہ، جو مصر سے اٹلی بھیجا گیا، ۱۸۰۹ء میں محمد علی نے بھیجا تھا۔ ۱۸۱۸ء تک یورپ میں مصر کے ۲۳ طلبہ بھیجے گئے۔ اسی عرصے میں ایرانی طلبہ کا پہلا گروہ بھی یورپ بھیجا گیا تھا۔ محمد علی نے ۱۸۲۶ء میں مصر کے ۴۴ طلبہ کو پیرس روانہ کیا۔ ۱۸۲۷ء میں محمود سلیم دوم نے ترکی سے ۱۵۰ طلبہ یورپ کے مختلف ملکوں میں بھیجے۔ پھر یہ سلسلہ عام ہوگیا۔ برنارڈ لیوس، "The Middle East and the West" (لندن، ۱۹۶۴ء) ص: ۳۹

[15] نجلا عزالدین "عرب دنیا" اردو ترجمہ، ڈاکٹر محمود حسین (لاہور، ۱۹۶۳ء) ص: ۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان لوگوں کا اثر و نفوذ خدیو اسمعیل کے زمانے میں انتہا کو پہنچ گیا، جس نے مصر کو یورپ کا ایک حصّہ بنا دینے کی سعی کی اور مصر میں مغربی اوضاع و اطوار کو پھیلانے اور ترقی دینے کے جوش میں بہت بڑا خزانہ صرف کر ڈالا۔ چنانچہ مصر برطانیہ اور فرانس کا مقروض ہو کر سیاسی لحاظ سے بھی ان دو ملکوں کا دست نگر بن گیا۔ بعد میں عرابی پاشا کے احساسات بھی برطانیہ اور فرانس کے لیے مخلصانہ رہے، بلکہ برطانیہ کے لیے یہ احساسات دلی جوش سے لبریز تھے[16] یہ اسی کے عہد کا المیہ ہے کہ ۱۸۸۲ء میں مصر برطانوی قبضے میں چلا گیا۔

مصر جن دنوں مغرب سے اپنے روابط کو استوار کر رہا تھا، شام اور لبنان بھی نئی کروٹیں لے رہا تھے۔ شامیوں اور خاص طور پر لبنان کے ترقی پسند عیسائیوں نے یورپی اور امریکی درس گاہوں کی سرپرستی کی۔ ترکی میں مغربی تہذیب کو اختیار کرنے اور یورپی زبانیں سیکھنے میں وہاں کے عیسائیوں اور دیگر غیر مسلم باشندوں نے پہل کی تھی۔ لبنان اور شام میں بھی یہ لہر اسی صورت میں آئی۔ مسلمان ممالک میں مغربی تعلیم یافتہ عیسائی باشندوں نے سارے معاشرے کی پار بار آوری (cross-Fertilization) میں حصّہ لیا[17] جغرافیائی اور تجارتی اعتبار سے یورپ کے ساتھ لبنان کے تعلقات قدیم زمانے سے قائم رہے ہیں[18] لیکن انیسویں صدی میں عیسائی مبلغ مغربی تہذیب اور ذہنی بیداری کو جگہ جگہ پہنچانے کا وسیلہ بن گئے[19] ترکی اور مصر میں، اور بعد میں ایران و افغانستان میں، مغربیت حکمرانوں کے ایما سے پھیلی تھی اور دیگر ممالک میں سیاسی اور اقتصادی عوامل کے ذریعے داخل ہوئی تھی، لیکن لبنان نے بطور خود اسے اخذ کیا۔ اس لحاظ سے یہ پہلا ملک تھا، جس نے قدامت

---

[16] ڈبلیو ایس بلنٹ "Secret History of the British Occupation of Egypt" (لندن، ۱۹۲۳ء) ص: ۶

[17] فلپ کے حتی "Islam and the West" (پرنسٹن، ۱۹۶۲ء) ص: ۹۰

[18] زین این زین "Arab Turkish Relations and the Emergence of Arab Nationalism" (بیروت، ۱۹۵۸ء) ص: ۴۰

[19] حتی، تصنیف مذکور، ص: ۹۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو خیر باد کہا اور گرد و پیش کے ممالک کے لیے "مرکزِ تنویر" بنا۔[۲۰] تقریباً یہی صورت شام میں بھی رونما ہوئی۔ جلد ہی مغربیت اور تجدد کی دوڑ میں لبنان اور شام ترکی و مصر سے بہت آگے نکل گئے۔ مغربیت اور تجدد کو اختیار کرنے کا آغاز اس صورت میں ہوا کہ یورپ اور امریکہ کے معاشرتی اور قومی تصورات یا تو مکمل یا جزوی طور پر اخذ کر لیے گئے یا اُنھیں ملک کے حالات کے مطابق ڈھال لیا گیا۔[۲۱]

دُنیائے اسلام کے متعدد ملکوں میں قومی تحریکوں کے دوران جدید اور مغربی تصورات اور مغربی طرزِ حکومت کو رائج کرنا بھی مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثر کا ایک مظہر تھا، جو قومی تحریکوں کا ایک مقصد بن گیا تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی میں متعدد عرب ممالک میں مغربی اثرات ظاہر ہو چکے تھے، تاہم پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی ان اثرات کی زد ان ملکوں پر پڑی۔ یہ زد اتنی طاقت ور تھی کہ اس سے عرب کچھ عرصے کے لیے چندھیا گئے۔ اُنھوں نے کوشش کی کہ جلد از جلد ان طور طریقوں کی تقلید اور نقالی کریں اور اس طرح ترقی کر کے مغربی ممالک کے دوش بدوش چلنے لگیں۔ انھوں نے طرزِ حکومت، قوانین و دساتیر، نظامِ تعلیم، رہن سہن، طرزِ معاشرت اور آدابِ مجلس میں مغرب کی نقل کی اور یہ فرض کر لیا کہ غیر ملکی حاکموں کے مقابلے میں ان کی پست حالت کا صرف یہی علاج ہے۔ یہ کوششیں سراسر سطحی نوعیت کی تھیں، کیوں کہ یہ مغربی تہذیب کے چند پیش پا افتادہ مظاہر اور شعبوں تک محدود تھیں۔ بے سوچے سمجھے اور جلد بازی میں یہ ممکن نہ تھا کہ اس تہذیب کی اقدار کا تعین ہو سکے اور اس کی روح کا شعور پیدا ہو اور دل و دماغ میں وہ کیفیت پیدا ہو سکے، جس نے ابتداءً اس تہذیب کو جنم دیا تھا۔ ایک کوتاہی یہ بھی تھی کہ اُنھیں اپنے مزاج، اپنے معاشرے اور اس کی ضروریات کا قطعی علم نہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ اُنھیں مغرب کے کون سے اطوار اور کون سی اقدار قبول کرنی چاہئیں اور کون سی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربیت کو محض اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے "احساسِ کمتری" کے نتیجے میں قبول کیا گیا۔[۲۲] نتیجہ یہ نکلا کہ پریشان خیالی اور شک و شبہ

۲۰۔ اسی لیے اسے "بلد الاشعر" کہتے ہیں، حتی، ایضاً

۲۱۔ حتی، "عرب اور اسلام" اور ترجمہ مبارز الدین رفعت (دہلی، ۱۹۵۹ء) ص: ۲۴۵

۲۲۔ فان گرونی بام "Modern Islam" (برکلے، ۱۹۶۲ء) ص ۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی فضا چھا گئی اور بنیادی اقدار کی طرف سے بے توجہی اور عقلی اور مادی طرزِ فکر عام ہو گیا۔[۲۳] ان کا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اب سابقہ عقائد کو خیر باد کہہ کر ہی معیارِ زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے۔[۲۴]

اس کے علاوہ مغرب کا ایک بہت نمایاں اثر مغربی افکار و تصورات کے ایک سیلاب کی صورت میں مسلم ممالک میں ظاہر ہوا، اور اس نے سیاست، معیشت اور اخلاقیات کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ ان افکار و تصورات میں وطنی اور نسلی قومیت کا مغربی تصور مسلمانوں کے لیے نہایت مضرت رساں ثابت ہوا۔ مسلمان اپنے حقیقی تصورِ قومیت (ملّت) سے دُور ہو گئے اور ان میں ایسے خیالات عام ہونے لگے کہ وہ خود کو اپنی ملت کا ایک جزو سمجھنے کے بجائے وطنی، نسلی اور لسانی قومیت کا حصّہ سمجھنے لگے۔ چنانچہ ملتِ واحدہ انتشار اور تفریق کا شکار ہو گئی۔ اس طرح وہ تہذیب جو ہزار حیلہ و فریب کے ساتھ اسلامی تہذیب و معاشرت کا محاصرہ کر رہی تھی، تاریخ کے ایک طویل عرصے میں بالآخر اپنے مقصد کی تکمیل میں کامیاب ہو گئی۔ اس اختلاط و سرایت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے روایتی خصائص کھو دیے بلکہ اپنی روحانی بنیادوں اور رشتوں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔[۲۵] مغربی تہذیب کا سیلاب اسلامی مراکز میں داخل ہو کر زندگی کی روایتی اقدار کو بہا لے گیا اور زندگی کی وہ سادگی و جفاکشی، مردانگی اور حوصلہ مندی کی وہ ساری صفات ناپید ہو گئیں جو قدیم زمانے سے عربوں اور ترکوں سے منسوب تھیں۔

اسلامی مراکز یا عرب ممالک کے علاوہ مغربیت کے اثرات غیر عرب ممالک میں بھی کم و بیش اسی

۲۳ھ نجلا عزالدین، تصنیف مذکور، ص: ۳۰۴-۳۰۴، فی الواقعہ دنیائے اسلام میں "اسلامی عقلیت" مغرب کی طرف سے ایک تحفہ تھا۔ کینتھ کریگ "Counsels in contemporary Islam" (ایڈنبرا، ۱۹۶۵ء) ص: ۱۰۴، لارڈ کرومر نے اکثر یورپی تعلیم یافتہ مصریوں کو یوں مختص کیا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں "خارج از اسلام مسلمان" اور "خالی از ہمت یورپی" ہوتے ہیں۔ "Modern Egypt" (لندن، ۱۹۰۸ء) ج ۲، ص ۲۲۸

۲۴ھ محمد اسد "The Road to Mecca" (لندن، ۱۹۵۴ء) ص: ۳۴۷-۳۴۸

۲۵ھ اور بالآخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل محمد اسد نے اپنے قلب میں محسوس کیا تھا۔ ایضاً، ص ۱۰۳-۱۰۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی زمانے میں شروع ہوئے۔ خصوصاً بیسویں صدی میں ترکی کے انقلاب کا اثر ساری دُنیائے اسلام نے محسوس کیا اور ترکی کی انقلابی تبدیلیوں کو مکمل یا جزوی طور پر بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا۔ ایران میں مغربیت کا آغاز شاہ عباس صفوی کے ذریعے ہوا۔ صفوی عہد حکومت ایران کی تاریخ میں اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس عہد میں، بالخصوص سولھویں اور سترھویں صدی میں، مغربی خیالات اور معاشرت ایران میں سرایت کرنے لگی اور دوسرے، ایران شیعی مملکت قرار پایا اور عرب ممالک سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا۔[۲۶] مصر میں نپولین کی جارحیت (۱۷۹۸ء) اور اس کے ہندوستان پر حملے کے خواب نے بڑی طاقتوں کی نظروں میں ایران کی اہمیت واضح کر دی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں عباس مرزا بھی، ترک سلطان سلیم سوم کی طرح اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جنگ میں جدید سامانِ حرب اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں نے یورپ کو برتری عطا کی ہے، اس لیے ایران کو باقی رکھنے کے لیے مغربیت کے خطوط پر تدابیر اختیار کرنی ضروری ہیں۔ چنانچہ اس نے وہی کیا جو ترکی میں کیا گیا تھا۔ طلبہ یورپ بھیجے گئے۔ فرانس اور برطانیہ سے اساتذہ بلائے گئے اور مطبع قائم کیا گیا۔[۲۷] گو مغربیت کے رواج کی رفتار سست رہی، لیکن یہ بتدریج سرایت کرتی رہی اور بعد کے حکمرانوں نے اس طرزِ فکر و عمل کو برقرار رکھا۔ اس کے باوجود ایک عرصے تک اسے عمومیت اور عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ ملک میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریکات بھی اپنے متوازی اثرات عوام کی زندگی پر ڈال رہی تھیں۔ پھر علماء کی مدافعت بھی خاصی موثر تھی۔ ان کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مغربیت کے فروغ کی رفتار ساری دُنیائے اسلام میں سست ہی رہی۔ کیونکہ اس عرصے میں مغربی استعمار ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں پھیل رہا تھا اور مسلمان اس کے خلاف اپنے قلب کی کسی دور گہرائی میں ایک چنگاری محسوس کر رہے تھے۔ یورپی ممالک کے خلاف بعض مسلمان ملکوں میں مختلف تحریکیں اس کا مظہر تھیں۔ اس عرصے میں ایران میں مغربیت کے اثرات کی

---

۲۶ کوئیلرینگ "Interaction of Islamic and Political thought in Iran" مشمولہ: یہی مصنف، تصنیف مذکور، ص ۱۳۱

۲۷ ایضاً، ص: ۱۳۳، عبدالہادی حیری "Shi'ism and Constitutionalism in Iran" (لائیڈن، ۱۹۷۷ء) ص ۱۱-۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذمہ داری بڑی حد تک حکمرانوں کے بجائے ایران میں مقیم غیر ملکی باشندوں پر عائد ہوتی ہے، جس کا سلسلہ برطانوی باشندوں کو ملنے والی ڈاک و تار کی سہولتوں (۱۸۶۵ء)، ریلوے کی تعمیر اور کانوں کی کھدائی (۱۸۷۲ء)، ایک بنک کے قیام (۱۸۸۹ء) اور تمباکو کے اجارہ (۱۸۹۰ء) سے منسلک ہے[۲۸]۔ یہ سہولتیں مغربی اثرات اور اہم معاشرتی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ ملکی اور اندرونی حالات کے ساتھ ساتھ وہاں غیر ملکی ریشہ دوانیوں نے بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ برطانیہ اور روس دونوں نے جرمنی کے خلاف ایشیا میں جو محاذ تیار کیا، اس میں ایران کو بھی شامل کیا اور اسے اثرات کے لحاظ سے اپنے اپنے مفادات کے منطقوں میں تقسیم کر لیا۔ شمال میں روس اور جنوب میں برطانیہ نے اپنے قدم جمائے[۲۹]۔ ان حالات میں ایران میں بیرونی اثرات کی جو تصویر نمودار ہوئی، وہ ترکی میں اُبھرنے والی تصویر سے کہیں زیادہ نمایاں تھی[۳۰]۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مصطفےٰ کمال کی مساعی اور ترکی کے مذہبی، تہذیبی و سیاسی انقلاب کا اثر ایران میں یہ ہوا کہ وہاں عوامی حکومت کی تحریک کا آغاز ہوا۔ وہاں اس وقت کے فوجی آمر اور پھر وزیر اعظم رضا خاں بھی یہی چاہتے تھے اور ان کا صدر منتخب ہو جانا بھی یقینی تھا۔ وہ مصطفےٰ کمال کی پیروی میں یہ چاہتے تھے کہ ان کا ملک بھی مغربیت کو اپنا لے۔ جب انھیں دسمبر ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ کے لقب سے حکمرانی کا اختیار حاصل ہو گیا تو اُنھوں نے ملکی اصلاحات کو مغربی خطوط پر استوار کیا اور نئی تہذیب کی حوصلہ افزائی کی۔ تجدد اختیار کیا، قدیم معاشرت کے انداز تبدیل کیے، مغربی لباس منتخب کیا اور پردۂ نسواں کی مخالفت کی۔ ایسے سارے اقدامات ملک میں سرکاری احکام اور ترغیب کے ذریعے رائج کیے گئے۔ اس کے برعکس وہاں علما کے طبقے نے حکومت کے اس قسم کے اقدامات کی مخالفت کی اور حفاظتِ اسلام کے نام پر سرگرم تحریک چلائی۔ لیکن ملکی حالات اور حکومت کے جبر و استبداد میں اس تحریک کی کامیابی اور ردِ مغربیت کے امکانات بہت معدوم تھے۔

---

۲۸ کیمبرج، ج ۱، ص: ۶۸۸

۲۹ تفصیلات کے لیے: ایضاً، ص: ۶۸۸ - ۶۸۹

۳۰ ایضاً، ص: ۶۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افغانستان میں بھی حکومت ہی کے عمل سے مغربیت کا آغاز ہوا۔ امان اللہ خاں نے اصلاحات ہی کے توسط سے جدید رجحانات اور مغربی طرزِ معاشرت کو مملکت میں داخل کرنے کی کوشش کی، لیکن اُنھیں بہت کم کامیابی نصیب ہو سکی[۳۱]۔ صرف حکمراں اور متمول طبقے کے ایک حصّے نے مغربی طرزِ معاشرت کو اختیار کیا، باشندوں کی ایک بڑی تعداد ان اصلاحات اور ان کے متوقع فوائد سے بے نیاز رہی۔ طبعی، جغرافیائی اور معاشی حالات اور قدیم طرزِ معاشرت سے ان کی حد درجہ وابستگی نے اُنھیں بیرونی دنیا اور مغربی تہذیب سے آشنا ہونے کا موقع نہ دیا۔

ہندوستان میں صورتِ حال مختلف تھی۔ یہاں مغرب سے رابطے کی نوعیت ساری دُنیائے اسلام کے مقابلے میں خاصی برعکس تھی۔ دُنیائے اسلام میں مغربیت بڑی حد تک "مدافعتی جدیدیت" کے توسط سے داخل ہوئی تھی، جب کہ ہندوستان کو مغرب نے نہ صرف اپنے ہتھیاروں اور اپنے قانون کی مدد سے تاراج کیا،[۳۲] بلکہ تقریباً دو سو سال تک اس پر حکمرانی بھی کی۔ اس حکمرانی کا نتیجہ دیگر اسلامی ممالک کے مقابلے میں زیادہ تلخ اور توہین آمیز تھا۔[۳۳] اس نتیجے کے تحت ہندوستان نے مغرب سے ارادی اور غیر ارادی طور پر بہت کچھ سیکھا۔ مغرب کی حکمرانی کے نتیجے میں اہلِ ہند اور اہلِ مغرب کے مابین گہرے اور وسیع ذاتی مراسم قائم ہوئے اور مغربیت مختلف پہلوؤں اور سمتوں سے ہندوستانیوں کی روح میں سرایت کر گئی۔ سرایت کا یہ عمل اٹھارویں صدی کے ربعِ آخر سے شروع ہوا۔ اس سے قبل مغربی تہذیب کے اثرات ایک محدود علاقے تک سمٹے رہے[۳۴] اور وہ اتنے نمایاں نہیں تھے کہ ہندوستانی تہذیب کی عام صورت میں اور عہدِ وسطیٰ کی ذہنیت میں، جس پر یہ تہذیب مبنی تھی، کوئی تبدیلی پیدا کر سکیں۔ اس کی ابتدائی نشانیاں عیسائی

۳۱ؔ ناکامیوں کا ایک اچھا جائزہ، ایل بی پولادا "Reform and Rebellion in Afghanistan, 1919-29" (لندن، ۱۹۷۳ء) باب ہفتم میں ہے۔

۳۲ؔ برطانوی قانون کے اثرات کے لیے: عزیز احمد "Islamic Modernism in India and Pakistan" (لندن، ۱۹۷۰ء) ص: ۱۲-۱۹

۳۳ؔ ٹائن بی، "The World and the West." ص: ۳۴

۳۴ؔ تفصیلات کے لیے: عزیز احمد، تصنیف مذکور، ص ۱-۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبلغوں اور تجارت پیشہ حاکموں کے ذریعے سامنے آئیں۔ عام ہندوستانیوں کی زندگی پر مغربی تہذیب کے جس پہلو نے گہرا اثر ڈالا، وہ اس کے مادی اور صنعتی وسائل تھے۔ جدید اسلحہ جنگ، جو مغرب کا سب سے بڑا تحفہ تھا، پھر دخانی کشتیاں اور بعد میں ریل، تار برقی اور گیس کی روشنی نے بے انتہا مقبولیت حاصل کرلی۔ لیکن ان سے قطع نظر اہم انقلابی اقدام برطانوی حکومت کا ہندوستان میں جدید مغربی تعلیم کا نفاذ تھا۔

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں برطانوی حکومت نے خوب سوچ سمجھ کر ہندوستان کے روایتی اسلامی اور ہندو تعلیمی نظاموں کو انگریزی نظام تعلیم سے بدل کر ہندوستانی ذہن کا ایک دروازہ مغرب کی طرف کھول دیا۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے معاشرتی تصورات، پارلیمانی دستوری نظام حکومت اور قوم پرستی کے نظریات سے روشناس کرایا۔ تاریخ ہند کے مغربی دور میں ہندو موقع شناسی میں مسلمانوں سے بہت زیادہ تیز نکلے۔[۳۵] مسلمانوں کے برعکس ان میں اقتدار اور حیثیت کے چھن جانے کا کوئی احساس نہ پایا جاتا تھا، جو انھیں گم شدہ ماضی کے خیالات میں مگن رکھتا اور مستقبل سے بے نیاز کردیتا۔ اس قسم کا احساس محرومی ہمتوں کو پست کردیتا ہے اور اسی لیے طاقت کا وہ توازن کہ جس کا جھکاؤ اٹھارویں صدی کے بحرانی دور میں مسلمانوں کے خلاف تھا، انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی مسلمانوں کے خلاف رہا۔ ہندوؤں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے برطانوی عہد میں ہندو راج حاصل کرنے کی کوششیں آہستہ آہستہ جاری رکھیں۔ چنانچہ برطانوی حکومت میں انھیں اقتدار میں شمولیت حاصل ہوگئی جو ہتھیاروں کی مدد سے نہیں بلکہ مغربی نظام تعلیم اور قانون پر عبور حاصل کرنے اور امور مملکت میں شرکت اختیار کرنے سے ملا۔[۳۶] یہاں مسلمان ایک مدت تک برطانوی حکومت کو قبول کرنے میں پس و پیش میں رہے اور اسی وجہ سے بہت جلد ان کے مراسم انگریزوں سے قریبی اور گہرے نہ ہوسکے۔ چنانچہ امور مملکت میں شرکت اور جدید مغربی تعلیم کے ان فوائد سے، جن سے ہندو مستفید ہو رہے تھے، نصف صدی تک وہ بے نیاز رہے، لیکن بالآخر ان کا بند ٹوٹ گیا۔ اب ان کے سامنے دو راستے رہ گئے تھے،

۳۵ـ ٹائن بی، "The World and the West" ص: ۳۷

۳۶ـ ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اسلامی زندگی کی ترجیح، عقیدہ وایمان کی بنا پر، اور دوسرے مغربی طرز زندگی کا انتخاب، مادی قوت اور ترقی کی بنیاد پر[۳۷] برطانوی حکومت کے استحکام اور ہندوؤں کی اس میں شرکت کے موقع پر مسلمان زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ خاطر تھے۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی سے ان کی ہمت وحیثیت پر ضرب کاری لگی تھی۔ دوسری طرف ان کا سامنا دو ایسی قوموں سے تھا، جن میں سے ایک ان کے مقدر میں شریک رہنے کے باوجود، اپنے مفاد کی خاطر انہی کی بنیادیں اکھیڑنے کا کام کر رہی تھی اور دوسری ایک ایسی فاتح تھی، جو قوت اور خود اعتمادی سے لبریز اور ایک ایسی تہذیب ساتھ لائی تھی، جو جدت اور نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ اس صورت حال میں ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت، ناکامی کے احساس اور مختلف شکوک وشبہات کا سامنا تھا۔ اس نازک حالت اور پیچیدہ نفسیاتی کیفیت میں دو قسم کے تصورات اور ان کی حامل قیادتیں اُبھر کر سامنے آئیں۔ ایک تصوّر کے علم بردار روایات اور ماضی کے پرستار تھے اور دوسرے تصوّر کے حامی جدید مکتب خیال اور جدید تعلیم کے دلدادہ تھے۔ روایات اور ماضی کے علم برداروں نے کوشش کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کا تحفظ کیا جائے اور ایسی نسل تیار کی جائے جو اسلامی روایات اور تہذیب کی مبلغ اور داعی بن سکے۔ دیوبند اور ندوۃ العلما کی تحریکیں اس تصور کی علم بردار بنیں اور ان سے منسلک اور فیض یافتہ علما نے جدید مکتب خیال کے افراد کے بالمقابل قوم کو اسلامی تہذیب اور روایات سے قریب رکھنے میں پُر خلوص کوششیں کیں۔

جدید مکتب خیال کے حامی افراد کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلت وپستی اور ناکامی کی وجہ برطانوی حکومت سے دشمنی اور انگریزوں سے عداوت ونفرت ہے۔ مسلمانوں کو اپنے اس رویّے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اس خیال کے حامی افراد نے جدید تعلیم کے زیر اثر حاصل شدہ احساس کی مدد سے انگریزوں اور ہندوؤں کے مشترکہ خطرے کو محسوس کیا اور اس نے مصلحت بینی اور دور اندیشی سے مسلمانوں کے لیے اپنے نقطۂ نظر سے عافیت کا ایک راستہ تلاش کیا اور انگریزوں سے تعاون واشتراک کے ذریعے حالات کے مقابلے کا

---

[۳۷] ابوالحسن علی ندوی "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" (کراچی، ۱۹۷۳ء) ص: ۱۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوصلہ پیدا کیا ۔ اس کا طریق کار حکومت سے تعاون و اشتراک کے ذریعے بظاہر یہ یقین دلانا تھا کہ وہ انگریزی حکومت کا دشمن اور مخالف نہیں ۔ اسے اس کے صلے میں حکومت کے نظم و نسق میں شریک اور ملک کی معاشی زندگی میں خود کو باقی رکھنا ہے ۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ جدید مغربی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے اور مسلمانوں کو اس کے حصول کے لیے آمادہ کیا جائے ۔ چنانچہ اس مکتب خیال کے اکابر کی مساعی مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کی تعلیم کی ترویج و اشاعت پر مرکوز رہیں ۔ اس طرزِ فکر کی نمائندگی سید احمد خاں کر رہے تھے ۔ ان کی ساری حکمت عملی اور کوششیں اس غالب خیال کے ماتحت رہیں کہ انگریزوں کی حکومت بہت زیادہ طاقت ور ہے اور اسے طاقت کے بل پر ہٹایا نہیں جا سکتا ۔ مسلمان انگریزوں کے خلاف طویل جدوجہد اور متعدد جنگوں میں ناکامی کے بعد اب تھک چکے ہیں ، ان کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے ہیں ۔ انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کے حصول اور حاکم قوم کی معاشرت و تمدن اختیار کرنے اور ان کے ساتھ بے تکلف رہنے سے ان کی مرعوبیت ، ان کا احساسِ کمتری اور احساسِ غلامی دور ہو سکے گا اور اسی صورت میں نظر میں ان کی حیثیت بڑھے گی ۔[۳۸]

انگلستان کے سفر نے سید احمد خان کے ان خیالات کو مزید راسخ بنا دیا ۔ انھوں نے مغرب کو اس وقت دیکھا جب وہ اپنے تمدن و ترقی کے شباب پر تھا ۔ جدید علوم اور نئی صنعتیں اپنے عروج پر تھیں ۔ اس وقت مغربی معاشرے میں زوال و انحطاط کے وہ آثار ابھی نمودار نہیں ہوئے تھے ، جو بیسویں صدی کے اوائل اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اہل نظر کو صاف نظر آنے لگے تھے ۔ سید احمد خاں اس تہذیب اور معاشرے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ اور ساری فکری صلاحیتیں اس کی تائید و حمایت سے منسلک ہو گئیں ۔ وہ ایک نہایت مؤثر شخصیت کے مالک تھے ۔ انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر اپنی تحریک شروع کی ، جسے کامیابی نصیب ہوئی اور مسلمانوں میں جدید علوم کی ترویج کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ۔ لیکن اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت مغربی تہذیب کے عناصر سے بھی آشنا اور مانوس ہو گئی ۔

---

۳۸ سید احمد خاں "مقالات سر سید" مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی (لاہور ، ۱۹۶۲ء - ۱۹۶۵ء) جا بجا ، مثلاً ج: ۱ ، ص: ۳۸۱-۳۸۲ ، ج: ۱ ، ص: ۳۷-۳۸ وغیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید احمد خاں نے اپنی تحریک کے توسط سے، جس کی قیادت انھوں نے خلوص اور مستقل مزاجی کے ساتھ کی تھی، ہندوستان کے اسلامی معاشرے میں اس تعلیمی اور معاشی خلا کو بڑی حد تک پُر کیا، جو مغلیہ حکومت کے زوال کے نتیجے میں اور برطانوی اقتدار کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ بڑی حد تک اس تحریک نے مسلمانوں سے مایوسی اور بددلی بھی کم کی اور لائق اور پُرعزم نوجوانوں کی ایک نسل تیار کی، جس نے اسلام سے اپنی بنیادی وفاداری ترک کیے بغیر جدید حالات کے تقاضوں میں قوم کی سیاسی بیداری میں حصہ لیا۔ لیکن سید احمد خاں کی اس تحریک کا ایک بڑا اور لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مغربی تعلیم اور تہذیب پر حد درجہ اصرار نے مسلم معاشرے کے حالات اور تقاضوں سے قطع نظر اسے مغربیت کا واضح رنگ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ سید احمد خاں کی تحریک اور اُن کی کُل مساعی مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم سے ہو گئے۔ ان کی تحریک کی طرح اس تحریک سے فیض یافتگان میں بھی مسلمانوں کے لیے بڑی کشش پیدا ہو گئی اور حالات نے انھیں مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کا موقع فراہم کیا تو ان کے اثرات عام مسلمانوں تک پھیل گئے۔ اس طرح عام مسلمانوں کی زندگی آہستہ آہستہ مغربی تہذیب و معاشرت کا روپ اختیار کرنے لگی۔ چونکہ سید احمد خاں کی تحریک کا سارا زور اعلیٰ مغربی تعلیم کے حصول اور انگریزی زبان پر رہا، اس لیے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرہ محض مغرب کے علمی و ادبی رجحانات کے ساتھ آگے بڑھا اور مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کا شوق اور انگریزی زبان میں مہارت پیدا کرنے کا ذوق اس کے وابستگان پر غالب رہا۔ اس تحریک نے عمومی طور پر انگریزی کے اچھے مقرر، صاحبِ قلم، محکموں کے افسر اور انتظامیہ کے عہدے دار پیدا کیے، جن کا دائرہ اثر سرکاری ملازمتوں اور انتظامی اداروں تک محدود رہا۔ یہ انگریزی زبان بولنے، مغربی لباس پہننے اور مغربی رہن سہن اختیار کرنے کو اپنی ترقی سمجھنے لگے۔

سید احمد خاں نے جس محدود مغربی تہذیب کو دیکھا اور جو تہذیب مغرب سے برعظیم پہنچی، وہ تمام تر روشن اور صحت مند نہیں تھی۔ اس میں اخلاق و روحانیت کا فقدان تھا۔ ہوس ملک گیری، تکبر، انانیت اور دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھنا اس کی واضح علامتیں تھیں اور انھی منفی خصوصیات نے انگریزوں کو ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ قوم بنا دیا تھا۔ برعظیم کے بہت کم باشندوں کو مغربی تہذیب کے جیسے تیسے روشن اور تابناک پہلوؤں کو دیکھنے کا موقع ملا، ورنہ جس مغربی تہذیب سے ان کا یہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واسطہ پڑا وہ ان کے لیے حیات بخش تہذیب نہ تھی۔ یہاں جو تہذیب روشناس ہوئی اور جن لوگوں کے ساتھ یہاں پہنچی، وہ زیادہ تر معمولی دل و دماغ کے لوگ تھے جو تعلیم یافتہ انگریزوں میں سے خود انگلستان کے لیے سیاسی اور ذہنی اکابر چھننے کے بعد بچ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو نوجوانی کی کچی عمروں میں اپنے مرکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بھیج دیے گئے تھے اور جنھوں نے یہاں آکر سپتے تکبّر اور اپنی انانیت اور احساس برتری اور جھوٹی شان و شوکت اور ملمع سازی جیسے اطوار کے سوا کچھ نہ دکھایا۔ چنانچہ یہاں جس مغربی تہذیب نے فروغ پایا، اس میں ان ظاہری صفات کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ جن ہندوستانیوں نے اس تہذیب کو قبول کیا، وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی تو بولنے لگے اور وضع قطع اور رہن سہن میں انگریز کا بگڑا ہوا چربا تو بن گئے[۳۹] لیکن ان کی ذہنی اور تخلیقی صفات سے کورے رہے[۴۰] اور ان سے کچھ سیکھا بھی تو ان کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر اختیار کیا اور بے اصول، غیر متوازن، قومیت باختہ اور خود پرست ہو کر رہ گئے۔ اس طرح مغربی تہذیب نے برعظیم میں ایک حد تک یک رنگی تو پیدا کر دی مگر ہم آہنگی پیدا نہ کر سکی[۴۱]

۳۹؎ مثلاً اس کی کچھ مثالیں، دسمبر ۱۸۲۳ء میں بشپ ہیبر کی تحریر کردہ یادداشت کے حوالے سے عبداللہ یوسف علی نے دی ہیں: "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" (کراچی، ۱۹۶۷ء) ص: ۲۲۷-۲۲۸

۴۰؎ ایک مغربی مصنف ریمزے میکڈانلڈ نے اس کی مثال "خوب صورت مغلیہ محلات کو ٹاٹنہم کورٹ روڈ کے شکستہ سامان سے آراستہ کرنے" سے دی ہے: "The Government of India" (لندن، ۱۹۱۹ء) ص ۱۷۱، اس کے خیال کے مطابق ہم نے اس کو صرف یہی نہیں سکھایا کہ وہ اپنی تہذیب کو حقیر سمجھ کر ترک کر دے بلکہ ہم نے یہ بھی بتایا کہ خالی جگہ کو ایسی اشیا سے پُر کرے جو آب و ہوا کو برداشت نہیں کر سکتیں .... ہم نے مشرقی دماغ کو مغربی طمانیت اور ماحول دینے کی کوشش کی، لیکن ہم کو پوری کامیابی اس میں ہوئی کہ دونوں میں ذہنی اور اخلاقی بدنظمی قائم کر دی۔" —— ایضاً، ص: ۱۷۱-۱۷۲

۴۱؎ ڈاکٹر سید عابد حسین "قومی تہذیب کا مسئلہ" (دہلی، ۱۹۵۵ء) ص ۱۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ صورت حال کم و بیش ساری دُنیائے اسلام میں پیدا ہوئی۔ مغربی فکر و تہذیب کے اثرات نے دنیائے اسلام کے روایتی معاشرے کو اس حد تک تبدیل کر کے رکھ دیا کہ اس کا اپنا مخصوص انداز اور تشخص ایک حد تک ناپید اور مسخ ہو کر رہ گیا۔ لیکن انہی حالات اور اثرات میں ایسی صورتیں بھی سامنے آئیں اور ایسی شخصیات پیدا ہوئیں، جنھوں نے مسلم معاشرے کو مغربی رنگ و تہذیب سے محفوظ رکھنے کی اپنے طور پر سعی کی اور مغربی فکر و تہذیب سے اپنی نفرت کا برملا اظہار کیا اور ان کے خلاف نفرت و بغاوت کی ایک روح پیدا کی۔ خود عام مسلمان بھی مغرب اور مغربیت سے بالعموم گریزاں اور اوّلاً متنفر رہے، اور ان میں مغربیت کو اثر جمانے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ ترکی میں، جس کے توسط سے مغربیت کو دُنیائے اسلام میں سرایت کرنے کا پہلے پہل موقع ملا تھا، عوام کی اکثریت نے مغرب کی پیروی کو ضروری خیال نہ کیا۔ وہ مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے بدستور قدامت پرست ہی رہی ہے۔ حکمرانوں نے ان کی مرضی اور خواہش کے بغیر مغرب کے اصول اور تصورات ان پر مسلط کیے تھے۔ نئے حالات نے ان کے ذہنوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی مغرب پرست بھی، جن میں "تنظیمات" کے مفکر بھی شامل تھے، ملک کی مغرب مخالف اکثریت کی طرح بنیادی طور پر قدامت پرست بھی تھے[۴۲] چند ترک اور مصری مفکرین نے، جنھوں نے یورپ کو قریب سے دیکھا تھا اور جن میں سے ایک بہت مؤثر شخصیت رفعت رفیع طحطاوی کی تھی، مغربی تصورات پر تنقیدی نظر رکھتے تھے اور انھوں نے مغربیت کی مخالفت کی۔ طحطاوی اور "تنظیمات" کے مصلحین کا پختہ خیال تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، یہ اور مشرقی تمدن، عیسائیت اور یورپ سے برتر ہیں اور اس کے باوجود کہ یہ اب خطرے میں ہیں اور ان کی ماضی کی حیثیت اب برقرار نہیں، پھر بھی ان کی بنیادوں کی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں[۴۳] ایسے مفکرین کا یہ عقیدہ تھا کہ اسلام ایک متحرک سماجی مذہب ہے اور یہ کسی طرح مانعِ ترقی نہیں۔ خود اس کی حرکت میں اصلاح کی صفات موجود ہیں۔ صدیوں سے اسلام نے معاشرہ اور حکومت کی تشکیل کے لیے جو کچھ کیا ہے، انھیں مغرب اب اختیار کر رہا ہے۔ اسلام میں ایسی صلاحیت اور قوت موجود ہے کہ جس سے ایک ایسی نئی اسلامی تہذیب کی تشکیل ہو سکتی

۴۲۔ سی۔ ای۔ ڈان "From ottomanism to Arabism" (اربانا، ۱۹۷۳ء) ص: ۱۲۶

۴۳۔ ایضاً، ص: ۱۲۷ - ۱۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، جو بیسویں صدی کی یورپی تہذیب سے زیادہ بہتر ہوگی۔ چنانچہ ان کی نظر میں مسئلے کا حل یہ نہیں تھا کہ مغرب کی تقلید کی جائے [۱۴۴]

مسلمانوں کی اکثریت کو، جو مغربیت سے بیزار تھے، ایسے خیالات سے خاصی تقویت پہنچی۔ انیسویں صدی کے اواخر سے عربی اور ترکی میں ایسی کتابیں اور ایسے جرائد بھی شائع ہونے لگے تھے، جن میں اسلام اور مشرق کی عظمت اور برتری کے اعتبار سے عیسائیت اور مغرب کی مخالفت کی جاتی تھی [۱۴۵] اسی عرصے میں دنیائے اسلام میں سید جمال الدین افغانی کے ایسے خیالات بہت مقبول ہوئے۔ بعد میں محمد عبدہٗ، رشید رضا، نامق کمال اور عبدالرحمٰن الکواکبی نے مغرب کی اندھی تقلید اور نری مغربیت کی مدلل مخالفت کی [۱۴۶] ان مفکرین میں کسی نے مغربیت کے تعمیری اور صحت مند عناصر اور رجحانات کو ناپسند نہیں کیا۔ تقریباً سب ہی ایسے عناصر کی تائید و حمایت میں رہے اور انھیں اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کیا۔ لیکن مغرب کے وہ تصورات اور نظریات اور ضابطۂ حیات، جو اسلام اور مشرقی تہذیب کی روایات کے برعکس تھے اور جن کو اختیار کر کے مسلمان اور دنیائے اسلام اپنے تشخص اور اپنے ملی مزاج سے دور ہو جاتے، ان کی تنقید اور مخالفت کا نشانہ بنے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہ نقطۂ نظر اور رویہ عام رہا۔ یہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان اور مغربی تعلیم سے گریز، ایک عرصے تک محض اس لیے کیا کہ وہ ان انگریزوں اور ان سے متعلق ہر چیز کے خلاف، جنھوں نے ان کی سیاسی بساط الٹ کر رکھ دی تھی، اپنے شدید اور مشتعل جذبات جلد سرد اور نرم نہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کے مغربی علوم سیکھنے اور انگریزی زبان پر عبور حاصل کر لینے کی متعدد روایات بھی ملتی ہیں۔ لارڈ میکالے کی قرارداد (۱۸۳۵ء) سے کئی سال قبل انھوں نے اپنی قوم کے لیے انگریزی تعلیم کے حصول کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ سے جب مسلمانوں نے

---

۱۴۴ ای آئی جے روزنتھال "Islam in the Modern National State" (کیمبرج، ۱۹۶۵ء) ص: ۴۱

۱۴۵ ڈان، تصنیف مذکور، ص: ۱۲۹

۱۴۶ تفصیلات کے لیے: ایضاً، ص: ۱۳۰ - ۱۴۰، وینٹر، روزنتھال، تصنیف مذکور، ص: ۳۸ - ۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی زبان پڑھنے کے بارے میں فتویٰ طلب کیا تو انھوں نے از روئے مذہب اسے جائز قرار دیا،[۴۷] لیکن بہر حال تہذیبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے، ان کے نزدیک فرنگیوں کے زیرِ تسلط ہندوستان "دارالحرب"[۴۸] تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برطانوی اقتدار کے خلاف عام مسلمانوں کی شدید نفرت کا اظہار تھا۔ بعد میں ردِ عیسائیت کی تحریک انہی مخالفانہ جذبات کی ایک شدید صورت تھی، جو حکومتِ برطانیہ کے خاتمے تک جاری رہی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں عیسائیت کے خلاف دُنیائے اسلام میں بڑے پیمانے پر مناظراتی ادب کے وجود میں آنے کا بھی یہی پس منظر تھا۔ رحمت اللہ کیرانوی کی تصنیف "اظہار الحق" اس سلسلے کی سب سے اہم تصنیف ہے، جس کے اثرات ہندوستان سے باہر دُنیائے اسلام کے دیگر ممالک، خصوصاً ترکی میں ظاہر ہوئے۔[۴۹] ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان میں سید احمد خاں کے متوازی علما کا نقطۂ نظر مغربیت کے معاملے میں خاصہ متشددانہ رہا۔ اگرچہ سید احمد خاں کی تمام تر وفاداریاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وابستہ تھیں اور وہ مغربی تعلیم اور تہذیب کو مکمل طور پر اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی شہرت، ان کے کاموں اور حقیقی مقاصد سے لاعلمی کے باعث زیادہ تر ایک انگریز حکومت کے وفادار اور مغرب پسند کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کا بنیادی سبب بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کا وہ طبقہ، جو انگریزوں اور مغربیت کا شدید مخالف تھا، سید احمد خاں کے اس جانب معمولی جھکاؤ کو بھی برداشت نہ کر سکا۔ دیوبند، ندوہ، فرنگی محل سے وابستہ متعدد علما علم اور تہذیب کے باب میں سید احمد خاں کے متوازی خیالات کی نمائندگی کرتے تھے۔

۴۷۔ "فتاویٰ عزیزیہ" (دہلی، ۱۹۰۴ء) ج ۱، ص: ۱۸۶

۴۸۔ ایضاً، ج: ۱، ص: ۱۷

۴۹۔ ڈان، تصنیف مذکور، ص ۱۲۹، یہ ۱۸۶۷ء میں قسطنطنیہ میں عربی میں شائع ہوئی اور بہت جلد اس کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوگیا، ایضاً۔ پھر اسے دیگر متعدد زبانوں میں منتقل کیا گیا، امداد صابری "آثارِ رحمت" (دہلی، ۱۹۶۷ء) ص ۳۸۳، ہندوستان میں ردِ عیسائیت کی تحریک کے لیے، اسی مصنف کی تصنیف "فرنگیوں کا جال" (دہلی، ۱۹۷۹ء) معلوماتی ہے، و نیز مناظراتی ادب کے لیے: راقم "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" (کراچی، ۱۹۷۶ء)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں میں جدید تصورات اور رجحانات اور تہذیب مغرب کی سب سے شدید اور موثر مخالفت اکبر الٰہ آبادی اور ابو الکلام آزاد نے کی۔ ان میں سے آزاد کا اثر، ان کے مجلّہ "الہلال" کے زمانۂ ادارت میں مسلمانوں کے اعلیٰ اور باشعور طبقے میں خاصے مقبول تھے۔ اکبر نے زیادہ تر نئی اور انگریزی تعلیم، تعلیم نسواں اور عورتوں کی بے پردگی جیسے رجحانات کی مخالفت میں اشعار لکھے۔ یہ رجحانات اس وقت مغربی تہذیب کے نمائندہ مظاہر میں شمار کیے جاتے تھے۔ مغربی تہذیب کی مخالفت اردو میں شائع ہونے والے بعض جرائد، مثلاً "الارشاد" (امرتسر)، نے بھی مستقل مزاجی سے کی۔ اس موضوع پر متعدد تصانیف بھی شائع ہوئیں، جن کا مقصد قوم کو بہر حال مغربیت سے دور کرنا تھا۔[۵۵]

عام مسلمانوں میں یہ مخالفت اور گریز پائی قدیم روایات سے اپنی وابستگی، مشرقی تہذیب سے لگاؤ اور عیسائیت اور غیر ملکی تسلط کے خلاف ان کے جذبات کے باعث تھی لیکن یہ مخالفت عام مسلمانوں میں اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود مغربیت کے اس سیلاب کو روک نہ سکی اور نئے تشکیل پاتے ہوئے معاشرے کے لیے کوئی ٹھوس اور مثبت بنیاد فراہم نہ کر سکی۔ یہ اعزاز اور امتیاز اقبال کو حاصل ہوا جنھوں نے اپنی فکر اور اپنے خیالات سے مغربیت سے نفرت اور اس کے خلاف بغاوت کی ایک نئی روح پیدا کر دی اور اس کے مقابلے میں اسلامی تہذیب اور مشرقیت کی برتری، پاکیزگی اور انسان دوستی کی اقدار کو اجاگر کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے دنیائے اسلام میں اقبال جیسے مغرب بیزار مفکر اور اسلام کے شیدائی نظر نہیں آتے۔ اگرچہ ان کی تعلیم بھی جدید مغربی خطوط پر ہوئی تھی اور انھوں نے ایک خالص ہندوستانی ماحول میں زندگی گزاری تھی اور ان کا خمیر اس سرزمین کی خاک سے تیار ہوا تھا۔[۵۶] جہاں جدید تعلیم پانے والے اکثر نوجوان مغربیت میں رنگ جاتے ہیں اور اگر ان نوجوانوں کو یورپ کے جدید تعلیمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے اور مغربی تہذیب کے سمندر

---

۵۵ کوئی اعلان جنگ مقصود نہیں تھا، عبد اللہ یوسف علی "Muslim culture and Religious thought" مشمولہ ایل ایس ایس او مے کے "Modern India and the west" (لندن، ۱۹۴۱ء، ص ۳۰۳)

۵۶
میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کف خاک برہمن زاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں غوطہ لگانے کے ایسے مواقع مل جاتے ہیں جو اقبال کو نصیب ہوئے تو وہ مغرب کی تقلید اور اس کے تصورات و اقدار اور تمدن کے پُر جوش حامی اور داعی بن جاتے ہیں ۔ لیکن اقبال مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کی "بھٹی میں سے سونا" بن کر نکلے تھے ۔

اقبال کے قیامِ یورپ کا زمانہ ان کے ذہنی اور روحانی ارتقا کی ایک اہم منزل ہے ۔ اس عرصے میں اُنھیں تہذیبِ مغرب کے مشاہدے اور اس کے عیوب و نقائص کو جانچنے اور ان کا تہذیبِ اسلامی سے موازنے کا موقع ملا ۔ یورپ میں اُنھیں تہذیبِ یورپ کی زر پسندی اور کم ظرفی نے بھی متنفر کر دیا [۵۲] اس عرصے میں قیامِ لندن کے دوران اُنھوں نے اسلامی دین و تمدن پر خطبات کا سلسلہ بھی شروع کیا ، جن کے موضوعات ، اسلامی تصوف ، اسلامی جمہوریت ، اسلام اور عقلِ انسانی اور مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر ، تھے [۵۳] وہاں رہ کر مشاہدۂ تہذیب اور تقابلی مطالعے کے نتیجے میں اقبال میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا ، وہ ان کا مغربی تصورات اور فلسفہ و تصوف اور وطنی قومیت سے متنفر ہو کر ذہنی اور قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا ۔ ان کی شاعری بھی قیامِ یورپ کے اثرات سے متاثر ہوئی ۔ بلکہ ممکن ہے وہ یورپ نہ جاتے تو ان کی زندگی اور شاعری کا رُخ کچھ اور ہوتا ۔ بہر حال یورپ سے واپسی کے بعد ان کی شاعری اور فکر ایک حیاتِ تازہ کا پیغام بن گئی ۔ اور یورپی تہذیب کی روح تک پہنچنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُنھوں نے اسلام کی بنیادی روح کو جدید یورپی خطوط اور جدید خیالات کی روشنی میں پیش کیا ۔ بلکہ اُنھیں اعتراف رہا ہے کہ ان کے فلسفے کی ہئیت مغربی تھی [۵۴] جدید مغربی تعلیم نے دُنیائے اسلام میں ان سے زیادہ مختلف دانش ور پیدا نہیں کیا ، اور اس صدی میں اہلِ نظر افراد میں کوئی ایسا نہیں جس نے مغربی تہذیب و افکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو [۵۵] اور اس قدر شدت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہو ۔ مسلمانوں کے

---

۵۲ یشخ عبدالقادر "نذرِ اقبال" مرتبہ محمد حنیف شاہد (لاہور، ۱۹۷۲ء) ص: ۱۲۴

۵۳ جاوید اقبال " زندہ رود " (لاہور، ۱۹۷۹ء) ج: ۱ ، ص: ۱۲۴

۵۴ این میری شمبل " Gabriel's Wing " (لائیڈن، ۱۹۶۳ء) ص: ۳۱۶

۵۵ " میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے ، اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے ۔ دانستہ یا نادانستہ مَیں اس نقطۂ نگاہ سے حقائقِ اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو (باقی اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی قدامت پرست طبقے کا ردعمل بھی ایسا ہی تھا، لیکن اس کے مقابلے میں اقبال کا طرزِ عمل مختلف ہے۔ ایک تو اقبال نے مشرقی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے نظریں نہیں چرائیں۔ ان کے کلام میں اس قسم کے بکثرت اشعار ملتے ہیں:

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمین اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

مغرب کی، خصوصاً علم و حکمت میں، برتری کے وہ ہمیشہ معترف رہے۔ اُنھیں وہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث سمجھتے تھے، جسے واپس لینا ان کے خیال میں مسلمانوں پر لازم ہے:

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذتِ ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلمان زادہ است
ایں گہر از دستِ ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرانشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اقبال کو یہ ملال تھا کہ علم و حکمت ان کے آبا و اجداد سے منسوب تھا، وہ اب یورپ کی ملکیت ہے۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کم از کم مغربی علم و دانش سے آگاہ ہوں، اس طرح ان کی مراجعت ان کی اپنی تہذیب کی طرف ہوگی، کیونکہ مغربی علم و حکمت اور علوم و فنون کا سلسلہ مسلمانوں سے جا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کے لیے کوئی خطرہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی بیداری کا ذریعہ بنے گی۔ ان کے خیال میں دُنیائے اسلام میں، مغربی تہذیب کی رو انگریزی تسلط کے ساتھ آئی تھی اور وہ کہتے تھے کہ یہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ وہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں[۵۶] اس لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان

(مسلسل بقیہ سابق) اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا" مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء، مشمولہ "اقبال نامہ" (لاہور، ۱۹۵۱ء) ج: ۱، ص: ۴۷

۵۶ے "اقبال کے حضور" (کراچی، ۱۹۷۱ء) ج: ۱، ص: ۲۸۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغرب کے صحت مند رجحانات کو قبول کریں اور اپنی فرسودہ خیالی ترک کر دیں۔ اس مقام پر وہ مغربی تہذیب سے زیادہ ان افراد پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو محض فرسودگی میں مبتلا ہیں:

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا　　افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

خود اقبال کے ذہنی ارتقا پر مغربی اثرات کا بڑا دخل تھا۔ مغربی علم و حکمت کے غائر مطالعے کے علاوہ متعدد مغربی مفکرین کے خیالات سے اُنھوں نے اپنی فکر کی آبیاری کی تھی۔ یہاں تک کہ چند مغربی مفکرین کے خیالات اور فکر اقبال میں حد درجہ مماثلت نظر آتی ہے[۵۷] اس کے علاوہ اقبال تہذیب و فکر مغرب کے مثبت پہلوؤں اور نیک اثرات کے قائل تھے:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقص دختران بے حجاب
قوتِ افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است

اُنھیں اعتراف تھا کہ ہیگل، گوئٹے اور ورڈز ورتھ سے اُنھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی کی اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں اُنھیں دہریت سے بچا لیا اور ساتھ ہی ساتھ بیدل اور غالب نے اُنھیں یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھیں[۵۸] گوئٹے کے بارے میں اُنھوں نے مزید اعتراف کیا کہ وہ ان کے رہنماؤں میں سے تھا۔ اقبال اگرچہ انگریزی زبان کے

---

۵۷ تفصیلات کے لیے: شمبل، تصنیف مذکور، ص: ۳۲۰-۳۳۳، بشیر احمد ڈار "Inspiration From the West" مشمولہ: حفیظ ملک "Iqbal, Poet Philosopher of Pakistan" (نیویارک، ۱۹۷۱ء) ص: ۱۸۷-۲۱۰

۵۸ "Stray Reflections" (لاہور، ۱۹۶۱ء) ص: ۵۴، تفصیلات کے لیے: شمبل، تصنیف مذکور، ص ۳۲۰-۳۳۳، ڈار، تصنیف مذکور، ص ۱۸۷-۲۱۰، غالب اور بیدل اور مشرقی فلاسفہ سے اثر پذیری کے لیے: عبدالحمید کمالی، "Heritage of the Islamic Thought" مشمولہ: حفیظ ملک، تصنیف مذکور، ص ۲۱۱-۲۴۲، و نیز شمبل، تصنیف مذکور، ص ۳۳۵-۳۷۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعدد شعرا کو پسند کرتے تھے، لیکن ان کی زیادہ دلچسپی جرمن ادب میں رہی، کیوں کہ اس میں مشرق کی روح سرایت کیے ہوئے تھی۔ چونکہ گوئٹے ان میں اس لحاظ سے سب سے ممتاز ہے اور اس نے اپنے "دیوان مغربی مشرقی" سے جرمن ادب میں مشرقی تحریک کو تقویت دی ہے، اس لیے اقبال گوئٹے کے زیادہ مداح تھے۔ البتہ ہیگل کے نظامِ فکر سے بعد میں وہ دور سے دور تر چلے گئے۔[۵۹]

اقبال اگرچہ مغرب اور اہلِ مغرب کے صحت مند رجحانات اور افکار کے معترف رہے اور ابتدائً اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر ان کی تنقید شدید نہیں تھی، لیکن بتدریج ان کا رویہ ترش اور سخت ہوتا گیا، یہاں تک کہ اپنے آخری زمانے کے کلام میں انھوں نے کہہ دیا:

مے از میخانۂ مغرب چشیدم   بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی   ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

یورپ میں اپنے قیام اور مطالعے کے دوران اقبال نے مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا جو بغور مشاہدہ کیا تھا، اس کے توسط سے انھوں نے اس فساد کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی تھی، جو اس کی مادیت پرستی اور مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار سے اہلِ مغرب کی بغاوت کی وجہ سے اس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ، جس کی تہ تک اقبال پہنچے تھے، یہ بھی تھی کہ مغربی تہذیب یونانی اثرات کی مظہر تھی، اور ان کی نظر میں اسلام کی اساسی تعلیمات یونانیت کے ایسے ہی خلاف ہیں، جیسے عبرانی پیغمبر۔ لہٰذا کسی ایسی تہذیب کو، جو یونانیت آمیز ہو، وہ پسند نہ کر سکتے تھے۔[۶۰] ان کی تو یہ بھی خواہش تھی کہ جس یونانیت نے مدتوں روحِ اسلام کو جامد کیے رکھا، اس سے یورپ بھی چھٹکارا حاصل کر لے اور یہ سرزمین بھی پیغمبرانہ تعلیمات سے معمور ہو۔[۶۱]

اقبال نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اب وہ دور نہیں رہا کہ یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوں۔ بلکہ اب تو ذہنی طور پر دنیائے اسلام تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے۔

۵۹؎ شمبل، تصنیف مذکور، ص ۳۱۶

۶۰؎ ایضاً، ص: ۳۱۸

۶۱؎ ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال اسے بُرا نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں مغربی تہذیب اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی توسیع ہے۔ لیکن اقبال کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں دنیائے اسلام محض اس کی ظاہری آب و تاب ہی میں اسیر نہ ہو جائے اور اس کی باطنی صفات تک نہ پہنچ سکے[۶۲] اور قلب و نظر کے اس فساد میں مبتلا نہ ہو جائے جس میں یورپ مبتلا ہے۔ انھوں نے اس فساد کو جو اس تہذیب میں بہت فروغ پا گیا تھا، آلودگی و ناپاکی پر محمول کیا ہے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبال کے خیال میں مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی اس کا بے دین ہونا ہے۔ یہی اس کا عیب ہے جس کی وجہ سے تمام اخلاقی برائیاں اور انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ اگر روحانی اور اخلاقی صفات اس میں موجود ہوتیں تو پھر یہ کیفیت نہ ہوتی:

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد | زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست | چشمِ او منور بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و حرام | حکمتش خام است و کاوش ناتمام

وہ سمجھتے تھے کہ مغرب نے تہذیب کو مصنوعی اور مادی رنگ دے کر اس کا رشتہ روحانی قدروں سے توڑ دیا ہے۔

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے | یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اور اس کا مشغلہ اور مقصد تجارت اور سوداگری بن کر رہ گیا ہے:

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو | ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کار زاری ہے

بظاہر اس تہذیب میں دلکشی، حُسن اور تعمیر و ترقی کے متعدد عناصر و مناظر نظر آتے ہیں، لیکن اقبال کے خیال میں ان کے پس پشت انسانیت کے لیے سوائے تاریکی اور خود غرضی اور وحشت و بربریت

۶۲؎ "Reconstruction of Religious thought in Islam" (لاہور، ۱۹۵۱ء) ص ۱۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اور کچھ نہیں ہے:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اقبال کو یقین تھا کہ یہ تہذیب، جو مثبت اور صحت مند بنیادوں کے بجائے کھوکھلی اور ظاہری بنیادوں پر استوار ہے اور اگرچہ اپنی عمر و تاریخ کے لحاظ سے جواں سال و نو عمر ہے، لیکن زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکے گی:

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اقبال کے خیال میں مغربی تہذیب کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ خود اس پر عمل کرنے والے اس کے مقتضیات کے خلاف عمل کرتے ہیں[۶۳] جو تہذیب کہ خود اپنی موت آپ مر رہی ہو، اقبال

---

۶۳ مکتوب بنام عبداللہ چغتائی، مشمولہ "اقبال نامہ" ح ۲، ص: ۳۴۸-۳۴۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہتے ہیں کہ وہ اقوامِ مشرق کو کیوں کر زندگی دے سکتی ہے:

یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر

چونکہ تہذیبِ نو نے عہدِ حاضر کو فسادِ قلب و نظر اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا، اس لیے اقبال کا پیغام مسلمانوں کے لیے یہ تھا کہ:

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

یا پھر:

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

مقامِ مردِ مسلماں ورائے افرنگ است

اقبال کو یقین رہا کہ اگر کوئی خود شناس ہو تو مغربی تہذیب اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اس کے مفید پہلوؤں سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے:

جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ

لیکن اقبال کو یہ طمانیت حاصل نہ ہو سکی۔ وہ جو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی تہذیب سے آگاہ ہوں تاکہ اس طرح خود اپنی اس تہذیب کی طرف مراجعت کر سکیں، جس سے مغربی تہذیب کی صحت مند بنیادیں استوار ہوئیں۔ مگر مسلمان یا تو سرے سے اس کے یکسر مخالف رہے یا اس کی اندھی تقلید میں مبتلا رہے اور تنقیدی بصیرت سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ قدامت پرستوں اور مغربیت کے دلدادہ افراد میں نقطۂ نظر کا جو بُعد تھا، وہ برقرار رہا:

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدہ میں کھو گیا کون

دُنیائے اسلام میں تجدد کی لہر بھی چونکہ مغربی اثر کے تحت آئی تھی، اس لیے اقبال تجدد کے علم برداروں سے بھی بدگمان رہے۔ اُنھیں یہ اندیشہ رہا کہ کہیں تجدید کی انتہا مغربیت میں ضم نہ کر دے:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُنھوں نے اگرچہ ایک طرف مصطفےٰ کمال کی بعض اصلاحات کو پسند کیا تھا، لیکن اس کے تجدیدی اقدامات کی سطحیت اور یورپ کی بے روح تقلید کی مذمت بھی کی تھی :

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود　　گفت نقش کہنہ را باید زدود

نو نگردد کعبہ را رختِ حیات　　گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست　　تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی　　کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مغربی تعلیم بھی اقبال کی شدید تنقید کا نشانہ بنی۔ اگرچہ وہ خود مغربی تعلیم کے پروردہ تھے، لیکن وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جو اس تعلیمی نظام کے نقائص سے نہ صرف محفوظ رہے بلکہ اس سے ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا اور اسلام کی عظمت و برتری پر ان کا یقین اور پختہ ہوگیا اور وہ اپنے نقد و بصر کے ذریعے مغربی افکار اور ان کی کمزوریوں اور خامیوں کو گہری نظر سے پرکھنے کے قابل بھی ہوگئے۔ وہ مغربی تعلیم یافتہ افراد حقائق کی جستجو اور سوزِ دروں سے عموماً خالی ہی رہتے ہیں :

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن　　پُرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

اقبال کے خیال میں مغربی تعلیم انسان کو دہریت اور مادیت سے قریب اور اخلاق و مروت سے دور کر دیتی ہے :

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے لیے

اقبال کو ملال تھا کہ مغربی نظامِ تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچل دیا ہے اور اُنھیں مردانِ کار کے بجائے مردِ بیمار بنا دیا ہے :

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ　　کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی　　فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

اقبال نے جس شد و مد سے مغربیت کا رد کیا ہے اور جس مستقل مزاجی اور تواتر سے اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف اپنے جذبات وخیالات بیان کیے ہیں، اس کے لحاظ سے یہ موضوع ان کی فکر و شاعری کا ایک اہم اور بنیادی موضوع بن گیا ہے۔ جدید دُنیائے اسلام کو جن اہم مسائل کا سامنا رہا اور جو اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے قومی و ملی وجود کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے تھے اور ان سے کنارہ کشی مسلمانوں کے تشخص کے لیے ضروری تھی، ان میں مغربیت کا مسئلہ بھی تھا۔ ان کی رد مغربیت کی خواہش اور کوشش اس غالب خیال کے ماتحت رہی کہ مسلمان مغربیت میں مبتلا رہ کر اپنے قومی ورثے اور ملی تشخص سے دور ہوتے چلے جائیں گے اور یہ ان کے وجود کے لیے نقصان دہ ہوگی۔

© rasailojaraid.com